جھارکھنڈ میں اردو غزل کی منفرد آواز: اختر مدھوپوری

ڈاکٹر جہانگیر احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،
آر۔ایس۔مور کالج،
گووندپور، دھنباد، جھارکھنڈ۔

تلخیص: اختر مدھوپوری کی غزلیہ کائنات میں روایت سے جڑاؤ بھی ہے اور نئی راہوں کی تلاش بھی۔ انہوں نے اپنے فکر و فن کے امتزاج سے نت نئے جہان معانی وا کئے اور غزل کو تازگی بخشی۔ ان کو مشرقی اقدار، اپنی مٹی کی خوشبو اور تہذیبی جڑوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کے شعری نقوش میں عملی زندگی کے وہ صدہا تجربات اجاگر ہیں جن کو انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق سے روبرو ہو کر حاصل کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یاس و ناامیدی کے ساتھ عزم و حوصلہ بھی ہے۔ ان کی حسیت محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عالم شامل ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات عام طور پر معرفت و تصوف، حیات و کائنات اور اخلاقیات و فلسفہ پر محیط ہیں۔ اختر مدھوپوری کی غزلوں میں احساسات، خیالات، معنی آفرینی اور طرز بیان کی تازگی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ تدبیر کاری سے باخبر ہیں بلکہ شاعری کی بھرپور تفہیم، تحسین اور جمالیاتی قدروں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فحاشی یا سوقیانہ پن کا کوئی گزر نہیں ہے۔ ان کی شعری بساط میں تہ دار اور بالواسطہ اسلوب کے بجائے متوازی بیانیہ اور بظاہر اکہرے اسلوب میں بھی اعلیٰ درجہ کی شاعری کے عناصر موجود ہیں۔ اختر مدھوپوری کا شعری مجموعہ ''کلیات اختر'' ہے۔

کلیدی الفاظ: غزل، مطلع، قطعہ بند، مقطع، وزن، بحر، قافیہ، ردیف، تغزل

شہود الحق اختر مدھوپوری جھارکھنڈ کے شعرا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ 18/جنوری، 1929 کو مدھوپور، ضلع دیوگھر، بہار میں پیدا ہوئے اور 7/فروری، 1996 کو اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اختر مدھوپوری کی طبیعت میں شوخی اور فکر میں رعنائی تھی۔ حق گوئی اور بیباکی ان کی ذات کا غالب عنصر تھا جس کی وجہ سے وہ سچ کے برملا اظہار سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ دوران تعلیم ہی ان کا ادبی ذوق و شوق پروان چڑھنے لگا تھا جس کو شعراء کی صحبتوں اور مدھوپور کی پر کیف و پر بہار فضا نے مرور وقت کے ساتھ اور گہرا کر دیا تھا۔

فنون لطیفہ میں ہر فن کی اپنی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسرے تمام فنون سے ممتاز ہوتا ہے۔ شاعری جو لطیف انسانی جذبات و احساسات کی اظہاریہ ہے اور جس کو صدیوں سے کسی قوم کی تہذیبی ارتقاء کا ایک پیمانہ گردانا گیا ہے، اس کی بھی اپنی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان میں ایک اہم خصوصیت اس کا الہامی ہونا ہے۔ اردو کے عظیم شاعر اسداللہ خاں غالبؔ شاعری کی اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ، نوائے سروش ہے

لیکن شعر و شاعری میں صرف مضامین ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ اس میں الفاظ کا در و بست اور انداز بیان بھی مساوی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ شاعری الفاظ کے توسط سے وجود میں آتی ہے اس لئے اگر خیالات بلند و بالا ہوں مگر اس کو پیش کرنے والے الفاظ سبک و شیریں نہ ہوں یا ان کو سلیقے سے استعمال نہ گیا ہو تو اعلیٰ خیالات بھی وہ لطف و تاثیر پیدا نہیں کر پاتے جو دل کو چھو سکیں۔ شعر و سخن کے اسی اہم نکتہ کو بیاں کرتے ہوئے اردو کے نامور شاعر خواجہ حیدر علی آتشؔ نے، جو اپنی شاعری میں زبان کا حسن اور رعنائی کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، کہتے ہیں:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے، آتش مرصع ساز کا

شاعری کی شعریات میں ان دو نکات کا اہم کردار ہے۔ اگر کوئی شاعر و سخنور ان نکات کی روشنی میں اپنے فن کا اعتراف کرا پانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اپنی شاعری میں حیات جاوداں پا سکتا ہے۔ ایک کامل شاعر کی طرح اخترؔ مدھوپوری نے بھی تمام اصناف شعر و سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی جدت طراز خلاقانہ ذہن و دماغ سے کام لے کر شعر و سخن کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کے اثاثۂ شاعری میں حمد و نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ سبھی شامل ہیں اور سبھی اصناف شاعری کو انہوں نے سلیقہ مندی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان، غزل گوئی ہے۔ اردو شاعری کی آبرو، غزل اپنے اندر بے انتہا رعنائی، دلکشی اور تاثیر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے کے نامساعد حالات اور تنقید کے تیر و نشتر کے باوجود آج بھی غزل پوری شان و شوکت کے ساتھ عصری حسیت کی معیت میں آگے بڑھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام میں اردو کی مقبولیت بڑھانے میں غزل کے ایجاز و اختصار، رمز و ایما، بلاغت و غنائیت اور دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی صفت کا ہی سب سے بڑا کردار ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے اور دونوں کو سمت و رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے۔" (1)

غزل کی شدید رمزیت، داخلیت، ماورائیت اور کلیت اسے خاص بناتی ہے۔ غزل کے ہر شعر کے اختصار میں وہ جامعیت ہوتی ہے جو قاری کے لیے مختلف جہان معانی وا کرتی ہے۔ غزل میں بظاہر اجمال و اختصار ہوتا ہے لیکن اس میں پنہا معانی ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ جس طرح دیگر اصناف میں تفصیل یا صراحت کامیابی کی شرط ہے، اسی طرح غزل میں اجمال اور کلیت کامیابی کی اولین شرط ہے۔ اسی بات کو وزیر آغا یوں کہتے ہیں:

''غزل کے شعر میں بات اشارے کنائے سے آگے نہیں جاتی۔اس میں تخیل اور تجزیئے کا وہ عمل مفقود ہے جو نظم میں ابھرتا ہے۔ یہ غزل کا نقص نہیں بلکہ اس کے مزاج کی ایک کیفیت ہے اور اسی میں غزل کا سارا حسن پوشیدہ ہے۔ ایمائیت اور رمزیت کا یہ عمل خود کو ہزار روابط اور تشبیہات واستعارات میں اجاگر کرتا ہے۔'' (2)

غزل میں تعمیم کا پہلو آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق شاعر کی روداد کو اپنی روداد سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غزل کے دو مصرعوں میں کسی واقعہ کی پوری تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی ہے اس لئے غزل کا شاعر مختلف طریقوں سے اس واقعے کی شدت کو قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وزیر آغا کے بقول:

''غزل بت پرستی کی ایک صورت بھی ہے اور بت شکنی کا ایک عمل بھی۔اس میں جز کا تحرک بھی ہے اور کل کا تھپک کر سلا دینے والا ہاتھ بھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل میں ان دونوں پہلوؤں کا بیک وقت وجود ضروری ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا اور وہ کسی ایک پلڑے کی طرف واضح طور پر جھک جاتی ہے تو اس سے غزل کا مزاج بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ اردو غزل کے تدریجی ارتقا میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جن میں غزل 'توازن' کی اس صفت کو برقرار نہیں رکھ سکی اور اس لیے کبھی تو خالص بت پرستی اور کبھی خالص تخیل پسندی کی رو میں بہہ گئی۔ تاہم بحیثیت مجموعی اس نے اپنی بنیادی صفت سے انحراف نہیں کیا۔ اردو غزل کی کامیابی کی وجہ جواز یہی ہے۔'' (3)

ہیئت کے اعتبار سے غزل ایک پابند نظم ہے جس کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ اور اکثر ہم ردیف ہوتا ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور مردف غزل کی صورت میں ہم ردیف بھی ہوتے ہیں۔ ایک سے زیادہ مطلع ہو تو دوسرے مطلع کو حسن مطلع کہا جاتا ہے۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص شامل کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کے اشعار اور ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن بھی ہوتے ہیں۔ وزن طے کرنے کے لیے بحریں تخلیق کی گئی ہیں جن میں کچھ بڑی بحریں ہیں اور کچھ چھوٹی بحریں۔ مسعود حسین خان مطلع، ردیف، قافیہ، مقطع اور بحر کو ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی مانتے ہیں۔ یوں تو غزل میں مقطع کا التزام ضروری نہیں ہے لیکن اس کے سرمایے میں بغیر مقطع کی غزلیں بہت کم ہیں۔ مطلع اور مقطع غزل کے لازمی عناصر میں شمار نہ ہونے کے باوجود اس قدر کثیر الاستعمال ہیں کہ ان کے بغیر غزل نامکمل سی محسوس ہونے لگتی ہے اور ان کے وجود سے غزل کی ہیئت کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

غزل کی ہیئت کو طے کرنے میں وزن اور قافیہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ بحر، قافیہ اور ردیف کے امتزاج سے غزل کی زمین تیار ہوتی ہے۔ بحر کے ساتھ قافیہ و ردیف کی نحوی مناسبت سے غزل کی زمین رواں و سبک ہوتی ہے۔ بحر، قافیہ اور ردیف سے غزل کا بنیادی تعلق ہوتا ہے کیونکہ بحر کے صوتی نظام میں ہی قافیہ و ردیف کے صوتی و نحوی تصرف سے غزل کے شعر کی تعمیر ہوتی ہے۔ کلام موزوں کے لیے وزن لازمی ہے اور وزن کی بنیاد ارکان ہیں۔ ارکان کے مناسب امتزاج سے بحر وجود میں آتی ہے۔ اردو شاعری میں بنیادی طور پر عربی ارکان اور ان کے مخصوص امتزاج سے بنی ہوئی بحریں

رائج ہیں۔ چونکہ یہ بحریں فارسی شاعری کے توسط سے اردو شاعری میں داخل ہوئیں اس لئے وہی بحریں اردو میں رائج ہیں۔ بحر کے ارکان پنج حرفی یا سات حرفی ہوتے ہیں جنہیں ارکان افاعیل کہتے ہیں۔

جس طرح بحر، قافیہ، مطلع اور مقطع غزل کی ہیئت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اسی طرح سے غزل کے کچھ فنی ضروریات بھی ہیں۔ غزل کا ہر شعر موضوعی اعتبار سے مکمل وحدت کا متقاضی ہوتا ہے اور ایک غزل کے تمام اشعار خیال و موضوع کے لحاظ سے متنوع ہو سکتے ہیں۔ غزل کے اشعار کی یہی داخلی خصوصیت غزل کی شناخت کا اہم وسیلہ بنتی ہے۔ غزل کی تمام نازک خیالی اور فنی بلندی تغزل اور اعجاز و اختصار کی مرہون منت ہے جو غزل کی داخلی ہیئت اور شاعر کی فنی صلاحیتوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی امتزاج سے شعر میں سادگی، اصلیت اور اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ایس۔ ساجد بخاری لکھتے ہیں:

> ''چونکہ غزل ہمارے جذبات و احساسات کی فطری غماز ہے اور مشرقی جذبات فطری طور پر موسیقیت کی گرفت میں ہوا کرتے ہیں۔ خوشیوں میں گنگنا اور غموں میں بین کرنا مشرقی مزاج کا فطری تقاضہ ہے لہٰذا اوزان و بحر سے پیدا شدہ غزل کی نغمگی جذبات کے اظہار میں انتہا درجہ کی اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔'' (4)

غزل ہماری جمالیاتی حسیات کا لطیف ترین اظہاریہ اور ہمارے سماجی و ثقافتی سفر کا ماحصل ہے۔ غزل عربی قصیدہ کے بطن سے پیدا ہوئی۔ عربی قصیدے کے تشبیب کے اشعار عشقیہ مضامین اور غنائیت کی بنا پر بے حد پر کشش ہوتے تھے۔ جب قصیدہ ایران پہونچا تو فارسی قصیدے نے بھی اس کی تقلید کی۔ خصوصا قصیدے کی 'تشبیب یا نسیب' کے مضامین، ایرانیوں کے مزاج کے موافق ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے فارسی کے مشہور شاعر رودکیؔ نے ان موضوعات کو قصیدے سے الگ کر کے غزل کو ایک صنف سخن کی حیثیت دی اور اسے غزل کا نام دے کر ادب میں ایک نئی صنف کا آغاز کیا۔ جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو فارسی شاعری کی دیگر اصناف کے ساتھ غزل بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اردو ادب میں داخل ہوئی۔ اس کی مسحور کن جذباتیت، داخلیت اور غنائیت نے اردو شعراء کو فورا اپنی جانب متوجہ کر لیا اور انہوں نے ابتدا ہی سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ غزل کی تخلیق کے دوران، شاعر کو اگر کوئی وسیع خیال اس بات پر مجبور کر دے کہ اس زمین میں اسے ادا کیا جائے مگر دو مصرعوں کا ظرف اس خیال کی وسعت کے لیے تنگ ہو جائے تو شاعر متعدد اشعار میں تسلسل کے ساتھ اس وسیع خیال کو پھیلا کر 'قطعہ بند' کے نام سے شامل غزل کر سکتا ہے۔ ہند و پاک میں غزل کی روایت بہت مستحکم ہے۔ ابوالکلام قاسمی کے بقول:

> ''برصغیر میں فارسی اور اردو غزل کی روایت کئی صدیوں کو محیط ہے۔ اس پورے عرصے میں زبان و بیان کے متنوع طریقہ کار کے ساتھ ساتھ، غزل کی شاعری میں فکری اور موضوعاتی تنوع کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ تاہم اس تنوع کو ہم کسی خاص مقام اور علاقے سے وابستگی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ غزل ایران میں بھی کہی گئی اور برصغیر کے دوسرے ادبی مراکز میں بھی۔ مگر فنی اور فکری اعتبار سے غزل کی پوری تاریخ میں ایک ایسا تسلسل ملتا ہے جس سے اس صنف سخن کی تہذیبی اور ثقافتی مرکزیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔'' (5)

اختر مدھوپوری کی غزلیہ کائنات میں روایت سے جڑاؤ بھی ہے اور نئی راہوں کی تلاش بھی۔ انہوں نے اپنے فکر و فن کے امتزاج سے نت نئے جہان معانی وا کئے اور غزل کو تازگی بخشی۔ ان کو مشرقی اقدار، اپنی مٹی کی خوشبو اور تہذیبی جڑوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کے شعری نقوش میں عملی زندگی کے وہ صدہا تجربات اجاگر ہیں جن کو انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق سے روبرو ہو کر حاصل کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں یاس و ناامیدی کے ساتھ عزم و حوصلہ بھی ہے۔ ان کی حسیت محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک عالم شامل ہے۔ یہ ممکن ہو سکا ہے ان کے تجربے، انوکھے لہجے اور نئے طریق اظہار کی بدولت جس میں ایک باشعور فنکار کے احساسات اور غور و فکر کا عکس واضح طور پر عیاں ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات عام طور پر معرفت و تصوف، حیات و کائنات اور اخلاقیات و فلسفہ پر محیط ہیں۔ اختر مدھوپوری کی غزلوں میں احساسات، خیالات، معنی آفرینی اور طرز بیان کی تازگی قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ تدبیر کاری سے باخبر ہیں بلکہ شاعری کی بھرپور تفہیم، تحسین اور جمالیاتی قدروں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فحاشی یا سوقیانہ پن کا کوئی گزر نہیں ہے۔ ان کی شعری بساط میں تہ دار اور بالواسطہ اسلوب کے بجائے متوازی بیانیہ اور بظاہر اکہرے اسلوب میں بھی اعلی درجہ کی شاعری کے عناصر موجود ہیں۔ اختر مدھوپوری کا شعری مجموعہ ''کلیات اختر'' ہے۔ اس کی پہلی غزل کے چند اشعار دیکھئے:

شعاع عقل کا جس سمت انعکاس گیا
ادھر کبھی نہ توہم زدہ قیاس گیا
فریب خوردہ ہے کس درجہ عہد نو کا بشر
بجھانے چاند کے جھرنوں پہ اپنی پیاس گیا
ورق ورق مجھے پڑھنا محال تھا اختر
جو آیا پڑھ کے فقط میرا اقتباس گیا

ان اشعار کو جز کی شکل میں نہیں، بلکہ بصورت کل پڑھئے، انسانی رویہ کا منظر نامہ سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ اشعار آفاقی ہو جاتے ہیں اور اختر مدھوپوری کی شاعری کی فکری و تخیلی پرتیں کھلتی ہیں۔ چونکہ غزل زمز و ایما کا صنف ہے اور اس کا اعجاز بھی یہی ہے کہ چند لفظوں کے دروبست سے ایک وسیع خیال کو بیان کر دیا جائے، اس لئے غور و فکر اور عقل و خرد کا صحیح استعمال کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرتی ہے۔ ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اختر مدھوپوری کی سب سے اہم خوبی سہل و رواں زبان اور محاوروں پر ان کی دسترس اور بندش کی چستی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس خوبی کا استعمال رسمی مضامین، خیال بندی اور لسانی ہنر مندی تک محدود ہے۔ نیز ان اشعار میں اس تخلیقی حدت کی بھی کمی نظر آتی ہے جو تجربے کی قلب ماہیت کر دے، اس وجہ سے اکثر تجربے محض سماجی یا واقعاتی حوالے بن کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ ان میں اختر مدھوپوری کی تخلیقی شخصیت کے نمایاں پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔

غزل انتہائی ایمائی صنف شاعری ہے۔ اشاریت کی بلاغت اور ابہام کی معنی خیزی غزل کا حسن ہے۔ اس لئے چھوٹی بحر میں شعر کہنا اور اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھالینا کسی بھی شاعر کے لئے ایک آزمائش ہوتی ہے۔ اگر وہ اس خاردار وادی سے صحیح سلامت گزر جانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی

کامیابی کی ضامن ہے۔ میر و غالب اور دیگر اکابرین شعرا نے چھوٹی بحروں میں لازوال غزلیں کہی ہیں۔ اخترؔ مدھوپوری نے بھی چھوٹی بحر میں اشعار کہے ہیں اور ایسے امکانات کو روشن کیا ہے جو مختلف احساسات کے حامل ہیں۔ ان احساسات میں واردات قلبی کا انداز بڑا دلنشیں ہے۔ دیکھئے چند اشعار:

مظلوموں کی آہ نہ لو تم
قہر و غضب للہ نہ لو تم
تیرہ شبی میں جی لو لیکن
قرض ضیائے ماہ نہ لو تم
غوطہ زنی سے باز نہ آؤ
جب تک دریا تھاہ نہ لو تم
چاروں جانب آگ لگی ہے
تنہا گھر کی راہ نہ لو تم
اختر مہر و ماہ کی صورت
کام کرو تنخواہ نہ لو تم

مذکورہ تمام اشعار میں فکری معنویت پوری شادابیت کے ساتھ اپنا برملا اظہار کر رہی ہے۔ غزل کے مضامین میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے میں تخیل کی جدت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جدت تخیل شاعر کو نئے نئے مضامین کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے اور نئے انداز بیان پیدا کرتی ہے۔ مذکورہ اشعار میں بھی مضامین کی رنگا رنگی اور جدت تخیل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پہلے شعر میں اس اسلامی عقیدہ کی گونج سنئے کہ مظلوم کی آہ سے عرش معلیٰ بھی ہل جاتا ہے اور ظالم پر اللہ تعالی کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے۔ اس شعر میں جس طرح مظلوموں کی آہ کے ساتھ قہر و غضب کا استعمال کیا گیا ہے وہ لفظی تلازمات کے اہتمام کا ادراک کراتا ہے اور پورا شعر اپنے آپ میں ایک مکمل استعارہ بن جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں بھی بشری انا کے اظہار کے لیے لفظی تلازمات کا اہتمام ملتا ہے اور تیرہ شبی کے ساتھ ضیائے ماہ کا تخلیقی استعمال اس کے معنوی وسعتوں کو وا کرتا ہے۔ تیسرے شعر میں ہمت مرداں اور عزم انساں کی گہرائی و گیرائی کا دلکش بیان تو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہی ہے نیز غوطہ زنی اور دریا جیسے لفظی و معنوی تلازمات کے اہتمام نے معانی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے جس کے ساتھ ایک متحرک، حسی پیکر بھی شامل ہو گیا ہے۔ چوتھے شعر کو موجودہ عہد کے نامساعد حالات، فرقہ وارانہ منافرت اور قومی بیگانگی کے پس منظر میں پڑھئے اور یہ محسوس کیجئے کہ کس طرح کوئی اعلی نمونہ فن، زمان و مکان کے حدود سے ماورا ہو کر عالمی و آفاقی بن جاتا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس طرح کے حالات امن و شانتی کے لٹیروں کے ذریعہ پیدا کئے جائیں گے، یہ شعر اپنی معنویت دیتا رہیگا اور غزل کا مقطع Prevailed lethargy یعنی مروج فرض بیزاری کے پس منظر میں پڑھئے تو یہ تلقین کتنا اہم ہو جاتا ہے اور گو کہ اس میں اخترؔ مدھوپوری نے خود اپنی ذات کو مخاطب کیا ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ یہ خطاب عام ہے جس پر عمل آرا ہو کر ہی کوئی قوم عروج و بلندی کے اعلیٰ مقام پر

فائز ہو سکتی ہے۔اس چھوٹی بحر میں بھی استعارہ سازی، لفظی و معنویاتی تلازمات کے استعمال اور متحرک حسی پیکروں کی تخلیق نے ان اشعار کو لازوال بنا دیا ہے۔کچھ اور غزلوں کے نمائندہ اشعار پیش ہیں:

تیرگی میں جدھر جاؤں
روشنی سا بکھر بکھر جاؤں
تو میرا آئینہ ہے سامنے آ
میں تیرا عکس ہوں نکھر جاؤں
جس پہ ہے آشیاں اسی پہ رہوں
میں بھلا کیوں شجر شجر جاؤں
میں ہوں آواز بازگشت اپنی
جس طرف چاہوں میں ادھر جاؤں
اب اسی میں ہے خیریت اخترؔ
میں خموشی سے اپنے گھر جاؤں

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ان میں نہ تو روایتی معشوق ہے نہ اس کا سراپا بلکہ زندگی کے گہرے تجربے ہیں۔ حقیقی زندگی کا زخم و درد ہے اور اس درد کا احساس ہے جو فرد اور معاشرے سے جڑا ہوا ہے۔ان اشعار میں اسلوب کی تازہ کاری، ندرت خیال اور پرواز تخیل نہایت خوبی سے ادا ہوئی ہے۔ان میں شاعری کی روایتی لفظیات سے استفادہ تو ملتا ہے لیکن شاعر کا انفرادی رنگ بھی نمایاں ہے۔اخترؔ مدھوپوری اردو غزل کے روایتی سرمایے میں عشق و محبت کے متعین رویوں، عشق حقیقی و عشق مجازی کو پیش کرنے کی ہنر مندی، لسانی سطح پر مناسبات لفظی کے اہتمام اور مخصوص موضوعات کی ترجمانی کے لیے متعین لفظیات سے پوری طرح واقف تھے۔ لیکن انہوں نے غزل کی روایت پر عمل کرتے ہوئے جدید تفکرات کو بھی گلے لگایا ہے جس سے ان کی غزلوں میں نئے رجحانات اور عصری مطابقت بھی داخل ہو گئی ہے۔

آپ بیتی کو کہانی لکھ دیا
آگ کو بھی ہم نے پانی لکھ دیا
زخم دل اپنا ہرا تھا اس لئے
ہم نے ہر موسم کو دھانی لکھ دیا
ہم نے ساون کی بھری برسات کو
ہجر کی ماری جوانی لکھ دیا
جس نے اختر اپنی کر لی ہے شناخت

وقت نے بھی اس کو گیانی لکھ دیا

ان اشعار میں روز مرہ کے عام انسانی معاملات کا خوبصورت اظہار ہے۔ان میں کوئی فلسفیانہ موشگافی نہیں ہے تاہم اظہار کا انداز اتنا توانا اور برجستہ ہے کہ بے ساختہ شاعر کو داد و تحسین دینے کو جی چاہتا ہے۔ان اشعار کی اشاریت ورمزیت، تاثیری کیفیت اور احساس جمال قاری کو متاثر کرتا ہے۔ان میں مقامی ماحول اور گنگا جمنی تہذیب کا جمالیاتی حسن بھی موجود ہے اور رمزیت، ایمائیت اور مشرقی طرز احساس بھی۔غزل کی ہیئت میں ردیف کے استعمال کا بنیادی مقصد، تمام اشعار کو ایک آہنگ کے تابع کرنا ہے تاکہ ردیف کے باعث غزل کے اشعار کی ریزہ خیالی زیادہ نمایاں نہ ہو اور غزل کے پس منظر کا حصہ معلوم ہو۔اس حوالے سے بھی اگر اختر مدھوپوری کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو بھی وہ اپنے فن میں کھرے اترتے ہیں۔ان کی زیادہ تر غزلیں مردف ہیں۔کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے:

حصار ذات سے باہر نکل پڑا ہوں میں
سمجھ میں آج یہ آیا بہت بڑا ہوں میں
سنا ہے وقت نے اک موڑ لے لیا ہے نیا
جہاں بھی لشکر حالات سے لڑا ہوں میں
میں برگ سبز تھا کب یوں ہی ٹوٹنے والا
کسی نے ضرب لگائی تو گر پڑا ہوں میں
منار نور کی مانند ہے وجود میرا
اندھیری راتوں میں جلتا ہوا کھڑا ہوں میں
سنبھل کے کام میں لانا خریدنے والے
لگے نہ ٹھیس کہ شیشے کا اک گھڑا ہوں میں
صبا صفت میری خصلت سرشت موم صفت
غلط مزاج کا اختر بہت کڑا ہوں میں

ان اشعار سے عیاں ہوتا ہے کہ اختر مدھوپوری نے محض مروجہ موضوعات کا ہی تتبع نہیں کیا ہے بلکہ اپنے مشاہدے سے نئے امکانات کی طرف بھی قدم بڑھایا ہے۔یہ روش ایک صحت منداور پر عزم ذہنیت کی دلیل ہے جس سے اختر مدھوپوری نے اردو غزل میں اعلیٰ ذوق کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ان کی غزلوں میں علامتوں کا بھی خوبصورت استعمال ہوا ہے جس کو انہوں نے مختلف پیکروں میں کہیں ایک ساتھ اور کہیں علاحدہ علاحدہ بھی فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ان اشعار میں صرف جذبات وتاثرات ہی نہیں ہیں بلکہ نظریاتی رموز و نکات بھی ہیں، نیز جہاں ان میں اسرار ازل کی گرہ کشائی ہے وہیں ہلکی پھلکی فلسفیانہ موشگافیاں بھی ہیں۔ان کی غزلوں میں لفظی توازن، تلازمات کا باہمی ربط اور ڈکشن کا پورا ایک نظام ملتا ہے جو کسی بھی تخلیق کار کی کامیابی کی اولین شرط ہے۔اسی بات کو بیان کرتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

"کسی فن پارہ کی بلند رتبگی کا تعین اس کی زبان کے تخلیقی امکانات سے کیا جاتا ہے لیکن زبان کی تخلیقی برتاو کی شناخت آسان نہیں۔ تاہم لفظ کے ابہام، اسراریت، اختصار اور تحرک سے اسے پہچانا جاتا ہے۔ کولرج نے لکھا ہے کہ اصل میں زبان کا بہترین حصہ صحیح معنی میں بذات خود ذہن کے عمل پر غور کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہ شعوری طور پر اندرونی عوامل اور تخیل کے عمل و نتائج کو مستقل علامات کے ذریعے تصرف میں لانے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ فنکار اپنے داخلی تجربات کو جن کا مستند اور معتبر ہونا شرط پیشین ہے، مناسب و موزوں لفظوں کی گرفت میں لے آئے۔ داخلی تجربہ ایسے لفظ، علامت اور پیکر کی تلاش کرتا ہے جو اس کے لئے ناگزیر ہے۔ شاعر اگر وسیع ذخیرہ الفاظ پر قادر نہ ہو یا ناگزیر لفظ اور مماثل لفظ میں فرق کرنے کا اہل نہ ہو، تو تخلیقی زبان پیدا ہونے سے پہلے ہی معرض ہلاکت میں پڑ جاتی ہے۔ اردو شاعری زبان کے اس غیر تخلیقی انداز کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔" (6)

اختر مدھوپوری نے خود کو ان خامیوں سے بچاتے ہوئے، وقت اور غزل کے تقاضوں کو پوری اہلیت کے ساتھ اپنے فن میں ادا کیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے شاعری میں نئی تعبیری جہتوں کی تخلیق اختر مدھوپوری کا نصب العین تھا اور اس منصب کی ادائیگی میں ان کی طبیعت و مزاج نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ گو کہ یہ آواز اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی ہے لیکن جب بھی جھارکھنڈ کے شعرا کا تذکرہ کیا جائے تو اختر مدھوپوری کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

حوالجات و مآخذ:

(1) اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، سال اشاعت 2002، صفحہ 409۔
(2) اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 1974، صفحہ 239۔
(3) اردو شاعری کا مزاج، وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 1974، صفحہ 260۔
(4) آزاد غزل کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ، ایس ساجد بخاری، ایم۔ آر۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، سال اشاعت 2006، صفحہ 25۔
(5) شاعری کی تنقید، ابوالکلام قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سال اشاعت 2001، صفحہ 88۔
(6) جدید شعری منظر نامہ، حامدی کاشمیری، ادارۂ ادب، شالیمار، سری نگر، سال اشاعت 1990، صفحہ 13۔
(7) کلیات اختر، ترتیب انعام الحق انعام، لاڈلی ڈجیٹلس، کلٹی، ضلع بردوان، مغربی بنگال، سال اشاعت 2013۔

☆☆☆